

قرآن مجید کے ہندی ترجمہ

جناب مولانا محمد فاروق خاں

قرآن مجید کے ہندی ترجمے کی کوشش کوئی نئی کوشش نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۲۰۰ء میں مہرنگ ہی رانگ ایک حکمران ہوا ہے۔ اس کے حدود سلطنت میں کشمیر سے لے کر پنجاب اور راجستھان تک کے علاقے شامل تھے۔ یہ وہ دور ہے جب سندھ پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ راجہ کی خواہش پر سندھ کے حاکم عبدالقادر نے ایک ایسے حاکم کو بھیجا جو ہندوستان کی زبانوں سے واقف تھا۔ وہ راجہ کے یہاں تین سال تک رہا۔ راجہ کی فرمائش پر اس نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور سورہ یس تک ترجمہ مکمل کر لیا۔ اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری کے مشہور و معروف سیاح ابن شہر یار نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے۔

قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ مغل بادشاہ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ مکمل ہے۔ اس ترجمے کی بعض خصوصیات کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ اس ترجمے کو دیکھنے کا شرف مجھے خود حاصل ہوا ہے۔ مولانا فضل الرحمن گنچ مراد آبادی نے غالباً اسی ترجمہ کا ذکر مولانا سید محمد علی سے فرمایا تھا۔ مولانا سید محمد علی نے لکھا ہے کہ ایک روز عصر کے وقت مجھے بلا کر ارشاد فرمایا:

”مولوی عبدالقادر صاحب کے ترجمے سے دو سو برس پیشتر مجھا کا (ہندی) میں

۱۔ بزرگ ابن شہر یار، کتاب عجائب الہند، تہران، ۱۹۶۶ء، ص ۳، ۴۔

۲۔ عرصہ ہوا یہ نسخہ مجھے ایک ایسے شخص نے دکھایا تھا جو پرائی اور نادر چیزوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔

نہایت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے۔

مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی (متوفی ۱۸۹۶ء) نے بھی قرآن کی کچھ سورتوں اور کچھ حصوں کا ترجمہ ہندی میں کیا تھا جو پہلے گلشن ابراہیمی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور بے حد پسند کیا گیا۔ دارالافتاء کاندھلا، نسل مظفرنگر نے قریبی زمانے میں اس ترجمہ کو دوبارہ شائع کیا ہے۔ اس کا ایک نسخہ میرے ذوق کتب خانہ میں موجود ہے۔

نواب حسن نظامی کا قرآن پاک کا کرایا ہوا ہندی ترجمہ بھی مشہور و معروف ہے۔ یہ ترجمہ مولانا غلام محمد صاحب (سابق پنڈت کیشورام شرما) اور کئی دوسرے ہندو اور مسلم ماہرین ہندی کی مدد سے تیار ہوا تھا۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ پہلی جلد ۱۶۲۸ء میں اور دوسری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی۔

قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ مولانا احمد بشیر فرنگی محلی اور غلام محمد قریشی نے بھی کیا تھا جو بغیر متن کے شائع ہوا تھا۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۹۲۶ء کے بعد شائع ہوا ہے۔

شیخ محمد یوسف قادیان (ضلع گورداسپور) نے بھی قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ کیا تھا۔ غالباً اس کی اشاعت ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان ہوئی تھی۔ پادری ڈاکٹر احمد شاہ مسیحی نے قرآن کے نام سے قرآن کا ہندی ترجمہ ۱۹۱۵ء میں راجپور، نسل دہرہ دون سے شائع کیا تھا۔ یہ ترجمہ بغیر متن کے چھپا تھا اس کے تین ایڈیشن نکلے۔ پہلا ایڈیشن پرتاپ پریس کانپور سے شائع ہوا تھا۔ انہی ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں نکلا۔ یہ ترجمہ عربی سے براہ راست کیا گیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ مختصر حواشی اور بائبل کے نوالہ جات بھی دیئے گئے ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے لئے یہ حواشی بڑے ہی کارآمد ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس ترجمہ کو ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جبل پور نے پھر شائع کرنے کا اتمام کیا ہے۔

بہار ضلع کانپور کے قاضی غازی علی صاحب (متوفی ۱۹۶۱ء) نے قرآن کا آسان ہندی زبان میں ایک ترجمہ کیا تھا جو قسط دار ماہنامہ اسلام کانپور میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے چند پارے چھپے تھے ۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی ہند نے قرآن کے پہلے پارے کا ہندی ترجمہ شائع کیا تھا جو پوٹو قرآن

کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اصل ترجمہ اردو زبان میں مولانا صدر الدین اسلامی نے کیا تھا۔ اسے ہندی میں منتقل کرنے کا فریضہ تین اشخاص نے انجام دیا، جس میں ایک غیر مسلم پنڈت کیلاشن ناتھ برہمپت بھی شامل تھے۔

حافظ امام الدین رام نگری نے قرآن کے آخری پارے کا ہندی ترجمہ ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا اس کے دو ایڈیشن نکلے۔ ایک متن کے ساتھ اور دوسرا متن کے بغیر۔ قرآن کا ایک ترجمہ ہندی میں نند کمار اوستھی نے لکھنؤ سے شائع کیا۔ انھوں نے قرآن کے متن کو بھی ہندی رسم الخط میں منتقل کر کے ترجمہ کے ساتھ رکھا۔ کچھ حواشی بھی لکھے۔

ہندی زبان کے مشہور ڈرافٹس مین اور ادیب بھارتیندر دہرش چندر (भारतेन्दु हरिश्चन्द्र) (متوفی ۱۸۸۵ء) نے بھی قرآن کا ہندی ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ یہ ترجمہ رسالہ ہرش چندر کا ۱۸۷۷ء کے جلد ۱۵، شماره ۲۰۱ سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

راقم الحروف کو بھی خدا کے فضل سے قرآن کا ہندی ترجمہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ ترجمہ مدیر الحسناات، رام پور کی نگرانی میں کیا گیا تھا۔ اس ترجمہ کے سلسلہ میں مجھے بعض ہدایات کی پابندی کرنا پڑی۔ مثلاً اصطلاحی الفاظ کو ترجمہ میں جوں کا توں رکھا جائے۔ یعنی اللہ، آخرت، رسول، زکوٰۃ کے قسم کے الفاظ کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ بلکہ یہی الفاظ ترجمہ میں استعمال کئے جائیں۔ البتہ کتاب کے آخر میں ان الفاظ کی تشریح کر دی گئی ہے۔ یہ ترجمہ حواشی کے ساتھ پہلی بار جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ادرا ب تک اس کے نو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اد پر قرآن مجید کے بن ہندی تراجم کا ذکر میں نے کیا ہے ان میں سے چند کو چھوڑ کر سبھی تراجم میری نظر سے گزرے ہیں۔ یہ تراجم اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں اس پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فن ترجمہ اور ترجمہ کی دشواریوں اور بالخصوص قرآن کے ترجمہ کی مشکلات پر مختصراً کچھ عرض کر دوں۔

کسی کتاب کا بہترین ترجمہ وہی ہے جس میں نہ صرف یہ کہ اصل کتاب کا مضمون کسی کسی یا تبدیلی کے بغیر منتقل ہو بلکہ اس کے ساتھ اصل کتاب کی تاثیر بھی منتقل کی جاسکی ہو۔

کلام بنیادی طور پر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا مقصد صرف کچھ باتیں یا معلومات پڑھنے یا سننے وانوں تک پہنچا دینا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ سامعین یا قارئین کی توجہ کو بھی بیدار کیا جائے۔ ان کے اندر سوئے ہوئے جذبات کو جگا یا جلانے، انہیں ان کیفیات کی شیرینی یا تلخی سے آشنا کیا جائے، جن سے بالعموم لوگ نا آشنا نظر آتے ہیں، اس سے آگے بڑھ کر اس کے پیش نظر کسی قوم یا پوری انسانیت کے اندر انقلاب برپا کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح کے مقاصد کے حصول کے لیے ظاہر ہے کہ سپاٹ اور سادہ بیان کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے جس قسم کا کلام درکار ہوتا ہے اسے کلام مؤثر کہہ سکتے ہیں۔

کلام کی دوسری قسم وہ ہے جس کا مقصد صرف آپ کے لیے کچھ معلومات فراہم کرنی ہوتی ہے جیسے جغرافیہ یا فرس کی کتاب میں آپ دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی کتابوں کا انداز بیان کلام مؤثر سے بالکل مختلف ہوگا اور ہونا بھی چاہیے۔ جغرافیہ کی کتاب میں شاعری یا خطبے کا انداز اختیار کرنا نہایت غلط اور مضحکہ خیز بات ہرگی۔

قرآن مجید کے بارے میں اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کا کلام مؤثر ہے۔ وہ کوئی سپاٹ اور ارہ کتاب نہیں ہے۔ اس کے کلام میں جو وقار، نور، بہاؤ، شیرینی، تلخی، ادب اور سوتی جان پایا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بے مثل ہے۔

ترجمہ بھی ایک تخلیقی کام ہے۔ ترجمہ اور تخلیق میں فرق کرنا صحیح نہیں۔ کامیاب ترجمہ وہی ہے جسے پڑھ کر محسوس نہ ہو کہ وہ ترجمہ ہے۔ نیز برزبان کا اپنا ایک مزاج اور لہجہ ہوتا ہے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر *IT IS GOING TO BE* کا ترجمہ یہ ہونے جا رہا ہے "ترجمہ کی زبان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا: "یہ ہونے والا ہے۔" ترجمہ میں ترجمہ کرنے والے کے جذب اندرون کی شمولیت ضروری ہے۔ کیونکہ اس نے بغیر اس کام میں اصلیت و صداقت کا وصف پیدا نہیں ہو سکتا۔ ترجمہ محض نقل نہیں ہے۔ ترجمہ میں اصل کے سارے ہی امکانات کو کم رہن سہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہ فریضہ کیوں کر ادا ہوگا اس کے

یہ ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اصل کا مفہوم و مدعا ہی نہیں، بلکہ اس کی تیزی و ٹیکھا پن، اس کی نرمی و لطافت اور اس کی دلکشی و جاذبیت وغیرہ بھی پیش نظر ہو۔ اس میں جو زور، نرمی، دلکشی و سادگی پائی جاتی ہو اسے بھی ترجمے میں اتارنے کی کوشش کی جائے۔ ترجمے کا کام صرف مکشوری سے نہیں چل سکتا۔ ممکن ہے کہ مکشوری میں کسی لفظ کے دیئے ہوئے معنی سے کچھ اور وسیع مفہوم میں اس کا استعمال کیا گیا ہو۔ مثلاً کسی نے لکھا ہے: یہ آئین چھوٹی بڑی قوموں کے EQUILIBRIUM پر قائم ہے۔ مصنف نے یہاں ایک خاص لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظ کا انتخاب بے معنی نہیں ہے۔ لغت میں اس کے معنی دیئے ہیں STATE OF BEING PERFECTLY BALANCED لیکن صاف ظاہر ہے کہ توازن اور غیر جانب داری (NEUTRALITY) کے ساتھ اس میں کوئی اور بات بھی شامل ہے۔ اب اگر ترجمہ میں یہی توازن یا غیر جانب دارانہ حالت دیکھ دیا جائے تو مصنف کا نشا ظاہر نہ ہو سکے گا۔ اس کی جگہ اگر آپ "ہم آہنگی" یا "جذب باہم" رکھتے ہیں تب کہیں جا کر مصنف کے اصل مدعا کا اظہار ہو سکے گا۔

بعض اوقات اصل عبارت یا لفظ کے کئی معانی نکل رہے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں سوچنا ہوگا کہ کیا اس میں کئی معنی پیدا کرنا مصنف کا نشا ہے؟ یعنی کیا اسے ایک رنگ میں کئی رنگے رنگوں کی آمیزش مطلوب ہے؟ یا اس کے ذہن میں محض ایک ہی مفہوم ہے لیکن اس نے لفظ یا جملہ ایسا لکھ دیا ہے کہ جس سے کئی معنی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ترجمہ میں پیروی مصنف کے نشا ہی کی کرنی ہوگی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ اپنے اصل معنی سے دور ہو کر ثانوی معنی میں استعمال ہونے لگتا ہے۔ اب اگر کوئی اصل معنی ہی کو ترجمہ میں رکھتا ہے تو یہ غلط ہوگا۔ کسی تقریر یا تحریر کا اصل مقصد خیالات کا ابلاغ ہے، لیکن اگر محض الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کر دینے سے مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا یا اس قوت یا اثر کے ساتھ منتقل نہیں ہوتا جس قوت اور اثر کے ساتھ اصل تحریر یا تقریر میں اس مفہوم و خیال کا اظہار ہوا ہے تو ایسی حالت میں الفاظ اور ان کی تقدیم و تاخیر اور جملوں کی ساخت وغیرہ میں تبدیلی لاکر یہ مقصد پورا کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر ترجمہ کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصل عبارت میں جملے کی کوئی ساخت قبیح ہو، لیکن ترجمہ کی زبان میں اسے اختیار کرنے سے فصاحت ختم ہو جاتی ہو۔ ایسی صورت میں اس سے پرہیز ضروری ہے۔

ترجمہ کے وقت اصل عبارت کے علاوہ اس کے بین السطور (BETWEEN THE LINES)

کو بھی پڑھنا چاہیے اور بین السطور (جو مفہوم ان الفاظ کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے۔ الفاظ میں ظاہر نہیں کیا گیا ہوتا) کی مدد سے اصل عبارت کا ترجمہ کرنا چاہیے۔ ترجمہ میں جہاں تک ممکن ہو مصنف کا رنگ اور اس کا طرز اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اصل مصنف کے رنگ کو ترک کر کے اگر مترجم اپنا رنگ اختیار کرتا ہے تو ترجمے میں مصنف کے بجائے مترجم چھپ جائے گا اور یہ ایک بہت بڑا عیب و نقص قرار پائے گا۔ ترجمے میں قسم کے ممکن ہیں، ایک لفظی ترجمہ، دوسرا آزاد ترجمہ جس میں اصل مصنف کے صرف خیالات کی پیروی الفاظ سے بے نیاز ہو کر کی جاتی ہے۔ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان۔ یہی تیسری قسم سب سے بہتر ہے۔ اسے تخلیقی (CREATIVE) ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔ خیال اور مفہوم اپنے باریک سے باریک پیچ و خم کے ساتھ ادا ہونے والے ترجمہ کا کمال یہی ہے۔ اس کے لیے مترجم کو اصل مصنف کی شخصیت میں اپنے کو گم کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ کرنے والا یہ ملحوظ رکھے کہ ظاہر بات یا عبارت کو اگر ترجمہ کی زبان میں لکھنا ہوتا تو مصنف کس طرح لکھتا بس اسی کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس جہت سے اگر ترجمہ کامیاب ہے تو اسے کامیاب کہا جائے گا۔ اس کی ایک مثال یہ دی جاتی ہے۔ انگریزی کا ایک فقرہ ہے :-

I AM THE GOD WHO WAS BORN OF THE MIND OF THE
CREATOR.

اس کا کامیاب ترجمہ یہ ہے: "میں وہ دیوتا ہوں جو کرتار کے من میں پیدا ہوا۔"

MIND کا ترجمہ ذہن، دماغ، دل بھی کیا جاسکتا تھا لیکن من ہی اس کا صحیح اور بہتر ترجمہ ہو سکتا تھا۔ اہل ذوق اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح (CREATOR) کا ترجمہ کرتار ہی موزوں تھا۔ مفہوم اور اثر کے لحاظ سے بھی اور صوتی اعتبار سے بھی۔

شاعری کے ترجمے کے بارے میں یہ بات مشہور و معروف ہے کہ اس کا ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ شاعری کے ترجمے میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس کو پابند نظم میں منتقل کیا جائے یا اسے آزاد نظم کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اس کے لیے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے بحر و کلمات کے انتخاب کا مسئلہ کم اہم نہیں ہے۔ مختلف بحر کی مختلف تاثیر ہوتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ شاعری کے ترجمے میں یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ اس کے ترجمے میں اصل متن سے وفاداری یعنی اس کی پیروی کس حد تک ضروری ہے۔ ترجمے میں تاہم گئی نیز تخلیقی اثر باقی رکھنے کے لیے اصل متن کی پروا بس ایک حد تک ضروری ہے ورنہ

یہ ترجمہ کوئی تخلیقی کارنامہ ثابت نہیں ہو سکتا اور نہ اس میں اسلی کی تاثیر ہی باقی رہ سکتی ہے۔ کسی نظم کا ترجمہ دراصل نوبت اور تخلیقی صلاحیت صرف کر کے اسے از سر نو جنم دینا ہوتا ہے۔

قرآن مجید جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کوئی سپاٹ کلام نہیں ہے۔ کسی عظیم شاعر یا سے کہیں بڑھ کر اس کے اندر زور و اثر اور نغمگی اور صوتی جمال پایا جاتا ہے لیکن بالعموم قرآن کے ہر ترجمے ہونے میں ان ان خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت نہیں ملتی۔ ترجمے اکثر لفظی کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے ترجمہ کی عبارت پھینکی ہو کر رہ گئی ہے۔ معاملہ چونکہ کلام الہی کا تھا اس لیے مترجمین ترجمے میں کسی آزادی کے روادار نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی یا اردو زبان میں جس حد تک زور و اثر لانا ممکن بھی تھا اس سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکا۔

جہاں تک اسٹائل، اسلوب اور ادبی محاسن کا تعلق ہے اس سلسلے میں قرآن کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری تھا کہ قرآن کے ترجمے کی زبان عام زبان سے ممتاز ہو۔ خود قرآن کی زبان اپنے زمانہ نزول کی عزلی سے ممتاز اور مختلف ہے۔ قرآن شراویہ نظم و دونوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔ شرمقفی میں ہم جانتے ہیں کہ اگر نشر کی ترتیب (PROSE ORDER) نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ عبارت کا حسن اور اس کی دلچسپی اس بے ترتیبی کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ لیکن ترجمہ اگر سادہ ہے تو پھر نشر میں بے ترتیبی اور تشدد ناگوار ثابت ہوگا۔

اس کے علاوہ ہم اشارہ کر چکے ہیں مصنف کا رنگ و انداز اور اظہار جذبات کلام کی جان ہے۔ اس کا لحاظ ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کسی شاہانہ کلام کو اگر سوقیانہ (بانا۔ بانا) زبان میں منتقل کر دیا جائے تو یہ اس کا خون کرنا ہوگا۔

(باقی)

لے یہ بھی تو ایک طرح کی آزادی ہے کہ الفاظ کی صفیں تو کھڑی کر دی جائیں مگر بیان اساطیر کی جو خوبیاں مصنف کو مطلوب تھیں، غائب کر دی جائیں۔ (رنے - صفحہ)